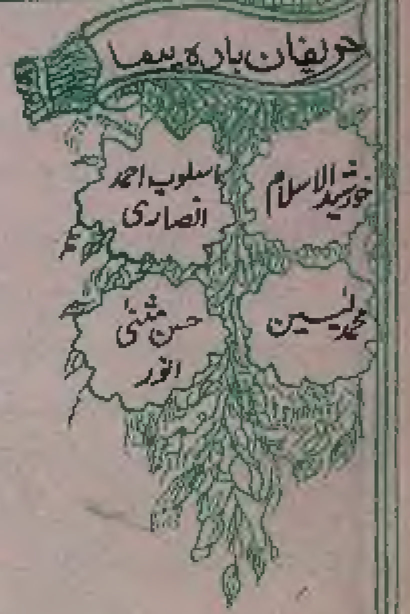
رجسٹرڈ نمبر اے ۴۰ | چندہ سالانہ پانچ روپیہ

علی گڑھ
The ALIGARH

علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کا پندرہ روزہ اخبار

یکم جنوری ۱۹۶۱ء | ایڈیٹر :- وارث کرمانی | جلد ۶ شمارہ نمبر ۷



تاثرات

علی گڑھ کے ادیب

اس بات کے ماننے میں غالباً لوگوں کو تامل نہ ہو گا کہ تقسیم کے بعد ہندوستان میں علی گڑھ ہی اردو ادیبوں کا سب سے بڑا مرکز رہ گیا ہے۔ مسلم یونیورسٹی میں اردو تعلیم کے رواج اور اردو ادیبوں کی معاشی کھپت اور ان کی ادبی تخلیقات سے لطف اندوز ہونے والوں کی کثیر تعداد کے سبب سے ملک کے مختلف گوشوں سے اہل قلم کھنچ کر یہیں آگئے ہیں اور آج کا علی گڑھ اٹھارویں صدی کا لکھنؤ ہو رہا ہے جہاں شمالی ہندوستان کے بیشتر شعراء آلام روزگار سے پریشان ہو کر شاہان اودھ کے زیر سایہ آگئے تھے۔ علی گڑھ کے بعد بمبئی اور کسی حد تک حیدر آباد میں بھی اُردو کے ادیبوں کا کچھ جمگھٹا ہے۔ علی گڑھ میں مسلم یونیورسٹی کے علاوہ انجمن ترقی اردو کا مرکزی دفتر بھی ہے اس لحاظ سے اردو کی ترویج و ترقی کی توقعات کے ساتھ ساتھ شعر و ادب کے میدان میں بھی نئے رجحانات اور فکر و نظر کے نئے معیاروں کیلئے ملک کے اُردو بولنے والوں کی نظریں اس طرف لگی رہتی ہیں۔ بدقسمتی سے علی گڑھ کی اس اہمیت کا احساس یہاں کے ادیبوں کو نہیں رہا ہے یوں تو متعدد ادبی انجمنیں یہاں کام کرتی رہی ہیں جن میں شعبہ اردو کی "انجمن اردوئے معلیٰ" اور انجمن ترقی اُردو کے "حلقہ ادب" کو نمایاں حیثیت حاصل رہی ہے اور ان کی محفلوں میں بیشتر ادیب شریک ہوتے رہے ہیں لیکن یہ محض مقالات سُننے شعر و شاعری سے لطف اندوز ہونے یا کسی مہمان کا خیر مقدم کرنے کے لئے منعقد ہوتی رہی ہیں۔ یہ احساس کہ علی گڑھ میں اُردو کے ادیبوں کا سب سے بڑی تعداد میں رہنا ایک اجتماعی ذمہ داری بھی عائد کرتا ہے۔ بہت کم لوگوں کو ہوا ہے اس کا احساس پہلی بار غالباً اس وقت ہوا جب یہاں کے ادیبوں نے ادبی انجمن کی بنیاد ڈالی جسکے صدر مجنوں گورکھپوری جیسے بلند پایہ ادیب مقرر کئے گئے۔ اس انجمن میں مختلف مکتبۂ خیال کے ادیبوں کو شریک ہونے کی دعوت دی گئی تاکہ ادبی مسائل پر آپس میں تبادلہ خیال کر کے فکر و خیال کے نئے راستوں کی تلاش کی جا سکے اور وہ اجتماعی بے عملی کی صورت بھی ختم ہو جو انجمن ترقی پسند مصنفین کے زوال کے بعد عام طور سے ادیبوں میں پائی جاتی ہے خوشی کی بات ہے کہ ہر مکتبۂ خیال کے ادیبوں نے اس کا خیر مقدم کیا۔ لیکن ادبی انجمن کے قیام کو بھی ایک سال سے زائد کا عرصہ گذر گیا اور ان میں کسی قسم کی سرگرمی پیدا نہ ہو سکی چنانچہ اس طرف کچھ عرصہ ہوا یہاں کے ادیبوں نے ایک ایسا پروگرام وضع کیا جس سے لکھنے والوں میں تخ بستگی کی کیفیت دور ہو اور ہمعصر ادب کا صحیح طور سے محاکمہ کر کے اس کا ایک آہنگ قایم کیا جا سکے اور اگر ممکن ہو تو تخلیقی صلاحیتوں کو ایک صحیح اور صحت مند رخ دیا جا سکے

اس کے لئے ہم نے دو طریقے اختیار کئے ہیں۔ پہلا طریقہ ادبی انجمن میں ہر شاعر کے منتخب کلام کو سن کر اس پر سیر حاصل بحث کرنا ہے اس طرح نئے لکھنے والوں کو بزرگ ادیبوں کی رہنمائی بھی حاصل رہے گی اور انھیں مزید لکھنے کی تحریک اور حوصلہ ملتا رہے گا۔ دوسرا پروگرام یہاں کے ادیبوں پر مختصر مضامین لکھوا کر ان کی ادبی سرگرمیوں سے اردو والوں کو باخبر رکھنا ہے اس کے لئے ہم نے خلیل الرحمٰن اعظمی صاحب کو تیار کیا ہے اور یہ مضامین تذکرہ شعرائے علی گڑھ کے نام سے شروع کئے جاچکے ہیں جو علی گڑھ کے صفحات پر برابر آتے رہیں گے۔ معاصرین پر کچھ لکھنا آسان کام نہیں ہے اس میں ادبی دیانت کو قائم رکھتے ہوئے ہمعصروں کی حساس طبیعت کو ملحوظ رکھنا پڑتا ہے خلیل صاحب اردو کے معتبر لکھنے والوں میں ہیں ان کی تحریروں میں اس قسم کا سلیقہ پایا جاتا ہے جس کی بنا پر وہ اس پُر خطر تنقید سے عہدہ برآ ہو سکیں گے۔ اس تذکرے میں جن شاعروں کا ذکر ہوگا ان کے نام تمہیدی مضمون میں دئے جا چکے ہیں لیکن شاعروں کے ذیل میں یہاں کے تمام ادیب نہیں آتے چنانچہ نثر لکھنے والوں میں فی الحال رشید احمد صدیقی، آل احمد سرور، عبدالعلیم، مجنوں گورکھپوری، نذیر احمد، خورشید الاسلام، اسلوب احمد انصاری، مختار الدین آرزو، اختر انصاری، خلیل الرحمٰن اعظمی، محمد حسن اور دوسرے حضرات کے نام لئے جا سکتے ہیں ان لوگوں پر بھی مختصر مضامین لکھوانے کے لئے کسی معتبر ادیب کی تلاش ہے اور یہ سلسلہ بھی جلد ہی شروع کیا جائے گا۔

ادبی انجمن میں "شاعر بتوسط شعر" کا سلسلہ بھی شروع ہو چکا ہے اس کی پہلی نشست میں خورشید الاسلام کا کلام سنا گیا اور اس پر آزادانہ بحث کی گئی محفل میں پروفیسر آل احمد سرور، خلیل الرحمٰن اعظمی، وحید اختر، اطہر پرویز، شہریار اور "مدیر علی گڑھ" نے شرکت کی۔ اس کی تفصیلی رپورٹ علیحدہ صفحہ پر دی جا رہی ہے آئندہ نشست کے لئے ہم یہاں کے ادیبوں سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ اپنی مصروفیات سے تھوڑا سا وقت نکال کر اس میں ضرور شرکت کریں۔ ہو سکتا ہے کہ بعض ادیبوں کو ہمارے اس پروگرام سے اختلاف ہو ممکن ہے وہ ذاتی وجوہ یا نظریاتی بنا پر آنے میں ہچکچاہٹ محسوس کر رہے ہوں ایسے حضرات سے میری گذارش ہے کہ تمام اختلافات کے باوجود ہم سب کے باہم ادیب ہونے کی مشترک خصوصیت کو ملحوظ رکھیں۔ ہمیں یقین ہے اگر وہ تھوڑا سا جبر کر کے بادلِ ناخواستہ بھی ان محفلوں میں شریک ہوں گے تو اختلافات کے مقابلہ پر متفق ہونے کے پہلو کہیں زیادہ سامنے ہوں گے۔

بیگم قدسیہ زیدی کا انتقال

ہمارے وائس چانسلر کرنل بشیر حسین زیدی صاحب کی رفیقۂ حیات بیگم قدسیہ زیدی کا انتقال یہاں ۲۷ دسمبر سنہ ۱۹۶۰ء کی صبح کو ہو گیا۔ بیگم مرحوم ایک روز پہلے بالکل صحتمند تھیں اور شام کو ہسٹری کانگریس کے مہمانوں کی پارٹی میں شریک تھیں۔ دوسرے روز صبح ان پر قلب کا دورہ پڑا اور قبل اس کے کہ کوئی معقول طبی امداد پہنچ سکے انتقال ہو گیا دوسرے وقت تین بجے تجہیز و تکفین عمل میں آئی۔ جنازے کے ساتھ یونیورسٹی کے علاوہ شہر کے معززین اور دہلی سے آئے ہوئے بہت سے حضرات نے شرکت کی۔

بیگم قدسیہ زیدی کی ذات ہندو پاک کے علمی و ادبی حلقوں میں محتاج تعارف نہیں انھوں نے ادب اور فن سے گہری دلچسپی لینے کے علاوہ بہت سے ادیبوں اور فنکاروں کی سرپرستی بھی کی۔ دہلی ناٹیہ سنگھ کی دو سال سے صدر تھیں اور ہندوستانی تھیٹر کی سکریٹری اور کنوینر بھی تھیں۔

ہندوستان کی مشترک تہذیب کی دلدادہ ہونے کی وجہ سے انھوں نے یہاں کی مختلف زبانوں کے ادب کو ایک دوسرے سے قریب لانے کی کوشش کی۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے انھوں نے خود بھی کالیداس کی تصنیف "شکنتلا" کا ترجمہ اُردو میں کیا۔ بچوں کے لئے بھی انھوں نے بہت سی کتابیں لکھیں جن پر حکومت کی طرف سے انعام دیا گیا۔

بیگم زیدی کا رچا ہوا شعر و ادب کا ذوق ان کی خوش طبعی و زندہ دلی اور سب سے زیادہ جد و جہد کرنے والے نوجوانوں کے ساتھ ان کی ہمدردی ایسی خصوصیات تھیں جنھوں نے انھیں سب کی نظر میں محترم اور ہر دلعزیز بنا دیا تھا وہ اپنی خوبیوں اور صلاحیتوں کی بنا پر نہ صرف اپنے شوہر کو مدد دیتی تھیں بلکہ ان کی ذات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے لئے ایک خاص زینت تھی۔

تعزیتی تجویز: — انکوائری کمیٹی کی مکمل رپورٹ ۲۷ دسمبر کو پیش کی جانے والی تھی لیکن بیگم قدسیہ زیدی کے اچانک انتقال کی وجہ سے اسے ملتوی کرنا پڑا۔ اراکین کمیٹی نے ایک تعزیتی تجویز منظور کر کے وائس چانسلر صاحب کے پاس بھیجی ہے۔ اس کے علاوہ علی گڑھ، دہلی اور دوسری جگہوں پر بھی بہت سے تعزیتی جلسے ہوئے ہیں۔

ادبی مجلس کی رپورٹ

ڈاکٹر خورشید الاسلام کی شاعری پر تنقیدی پروگرام

۲۴ر دسمبر ۶۹ء کو ادبی انجمن علی گڑھ کا ایک جلسہ پروفیسر آل احمد سرور کی صدارت میں ہوا۔ اس جلسے سے انجمن نے ایک خاص تنقیدی سلسلے کا آغاز کیا ہے جس میں ہمعصر شاعروں اور ادیبوں کو اس غرض سے مدعو کیا جائے گا کہ وہ اپنی نمائندہ تخلیقات پیش کریں جن کی روشنی میں ان کے فن کو سمجھنے سمجھانے اور اس پر صحت مند تنقید کی کوشش کی جائے۔ اس سلسلے کی پہلی کڑی ڈاکٹر خورشید الاسلام کی شاعری ہے سب سے پہلے ڈاکٹر وحید اختر نے خورشید الاسلام کی شاعری پر ایک مقالہ پڑھا۔ اس مقالے میں خورشید الاسلام کی شخصیت اور ان کی تخلیقی صلاحیتوں اور ان کے نظریۂ فن کا تجزیہ ان کے تنقیدی مضامین کی روشنی میں کرنے کے بعد ان کی شاعری کے بنیادی عناصر کا پتہ لگانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان کے موضوعات اور اندازِ بیان کی انفرادیت کو مقالہ نگار نے بڑی خوبی سے نمایاں کیا ہے۔ مقالے کے بعد خورشید الاسلام صاحب نے اپنی منتخب شعری تخلیقات پیش کیں۔

وارث کرمانی نے بحث کا آغاز کرتے ہوئے کہا کہ وحید اختر نے خورشید الاسلام کی شاعری کے نمایاں عناصر کو بڑی خوش اسلوبی سے بیان کر دیا ہے میرا خیال ہے کہ خورشید صاحب کی شاعری میں فنکار یا شاعر کا خلوص اور احساس کی شدت سب سے نمایاں عنصر ہے۔ ان کے یہاں ایک کلاسکی لہجہ ملتا ہے اگرچہ یہ لہجہ کہیں کہیں جذبات کے وفور کی وجہ سے شکست ہوتا نظر آتا ہے۔ چونکہ انھوں نے ترقی پسندی کے انتہا پسندانہ دور میں اپنی شاعری کا آغاز کیا لیکن ان کے یہاں فنی اقدار کا احترام بھی ہے اسلئے ان کا دم گھٹتا ہوا معلوم ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ انھوں نے باقاعدہ شاعری کی طرف توجہ نہیں کی اور آج بھی اپنی شعری تخلیقات کو پیش کرتے وقت وہ شاعری کا دعویٰ نہیں کرتے حالانکہ ان کے یہاں ایک کہنہ مشق شاعر کے کلام کی تمام خوبیاں ہیں کہیں سے ان کا کلام مبتدیانہ نہیں معلوم ہوتا لیکن وحید اختر صاحب کا یہ کہنا کہ ان کے یہاں تنقید کی نسبت شاعری کی صلاحیت زیادہ ہے میرے خیال میں قابل قبول نہیں میرا خیال ہے کہ ان کے یہاں تنقیدی صلاحیت شاعری کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ ان کی تنقیدی بصیرت اس معیار کی ہے جو اردو کے چند ممتاز ترین ناقدوں میں پائی جاتی ہے لیکن ان کی شاعری اس معیار کی نہیں ہے ویسے اس کی خوبیاں اپنی جگہ پر ہیں۔

شہریار نے کہا کہ اس بات کا پتہ چلانا کہ بنیادی طور پر کون نقاد ہے اور کون شاعر بڑا مشکل ہے۔ اس بات کا فیصلہ ہم صرف اسی کر سکتے ہیں کہ اس کا کون سا کارنامہ قابل قدر ہے لیکن یہ امر بھی اس پر منحصر ہے کہ کس ادیب کو کس صنف پر توجہ کا زیادہ موقع ملا ہے۔ خود حالی دونوں حیثیت سے ہمارے ادب میں معتبر مانے جاتے ہیں۔ اچھے نقاد کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ وہ نرا نقاد نہ ہو بلکہ اس کے اندر تخلیقی صلاحیت ہو۔ خورشید الاسلام صاحب کی تنقیدیں عام پیشہ ور نقادوں سے اسی لئے ممتاز ہیں کہ ان میں ہمیں تخلیقی ذہن ملتا ہے اسی لئے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بنیادی طور پر ایک تخلیقی فنکار ہیں اور اگر وہ تخلیقی ادب کی طرف زیادہ توجہ کریں تو اس میں ان کا کارنامہ وقیع ہوگا۔

خلیل الرحمٰن اعظمی نے کہا کہ وارث کرمانی صاحب کی اس بات سے مجھے بھی اتفاق ہے کہ خورشید الاسلام صاحب کی نظم و نثر دونوں کو سامنے رکھا جائے تو جس معیار کی ان کی تنقید ہے شاعری اس پائے کی نہیں لیکن اس بات سے میں یہ نتیجہ نہیں نکالتا کہ ان میں تنقیدی صلاحیت زیادہ اور شاعری کی صلاحیت کم ہے بلکہ یہ محض اس وجہ سے ہے کہ انھیں شاعری پر زیادہ توجہ کا موقع نہیں ملا۔ ان کے یہاں شاعری اب تک کبھی کبھار کا مشغلہ رہی ہے شعر میں اپنا منفرد انداز پیدا کرنے اور شعری سرمایہ میں کوئی اضافہ کرنے کے لئے جس ریاض کی ضرورت ہے وہ ان کے یہاں نہیں ویسے وہ صرف شاعر ہوتے تو انھیں اس وقت نئی نسل کے اچھے شاعروں میں شمار کیا جاتا لیکن تنقید میں ان کو ایک اچھا مرتبہ مل جانے کی وجہ سے ان کی شاعری کو بھی بلند معیار سے جانچا جائے گا اور اس کے لئے خورشید صاحب کو شاعری کی طرف اور بھی توجہ کرنی پڑے گی۔ ان کی شاعری میں تجربات کی انفرادیت اور انداز بیان میں ایک تیکھا پن ملتا ہے۔ ان کے لہجے میں بھی تازگی ہے۔ ان کی بعض چیزیں تو پرانے انداز کی ہیں لیکن بعض نظمیں جدید ذہن کی پیداوار ہیں اور اس قبیل کی ہیں جیسی اختر الایمان یا (باقی صفحہ ۱۱ کالم ۲ پر)

نیا سال مبارک

ہم علی گڑھ کے پڑھنے والوں کی خدمت میں نئے سال کی پُرجوش مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ امید ہے کہ یہ سال ہمارے ملک اور تمام عالم کے لئے پُرامن ثابت ہوگا۔ دنیا اس قدر تیزی سے بدل رہی ہے کہ ہمارا ایک سال پہلے زمانے کی ایک صدی سے بھی زیادہ تبدیلی و ترقی کا حامل ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے ہم اسے بجا طور پر اپنے ساتھیوں کے لئے فالِ نیک سمجھتے ہیں۔ انسان کیلئے ہر لحظہ ترقی کے نئے امکانات پیدا ہوتے رہتے ہیں یہ ضرور ہے کہ زندگی کی جدوجہد میں مشکلات کے بادل گھر کر آتے ہیں ناسازگار ہوائیں چلتی ہیں لیکن ان ہواؤں اور بادلوں کے تصادم سے نئے افق پیدا ہوتے رہتے ہیں اور روشنی کے نئے خطوط نظر آتے ہیں آدمی کو صرف ثابت قدم رہنے کی ضرورت ہے یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب ہم مستقبل سے پُرامید رہیں اور نئے سال کو تازہ مسرت کا پیش خیمہ سمجھیں۔

اسلوب احمد انصاری
ریڈر شعبۂ انگریزی

ہم نفسانِ رفتہ

عرصہ ہوا پروفیسر رشید احمد صدیقی نے اپنے بعض معاصرین پر قلمی مرقعوں کا ایک مجموعہ "گنجہائے گراں مایہ" کے عنوان سے شائع کیا تھا۔ زیر نظر کتاب اسی سلسلہ کی دوسری کڑی ہے۔ اس مخصوص صنفِ ادب کے بارے میں خود رشید صاحب نے یہ اشارہ کیا ہے، کہ یہ تاریخی دستاویز اور شاعری کے درمیان کی چیز ہے، یعنی اس میں نہ تاریخی تسلسل اور سلسلہ واری کے ساتھ واقعات کو منضبط کیا جا سکتا ہے اور نہ ذاتی تاثرات اور جذبات کو اس حد تک دخیل بنایا جا سکتا ہے کہ نتیجہ خطابت یا بین و بکا کی سرحدوں کو چھونے۔ بلکہ اس کا تمام تر تعلق حافظہ میں، موجود یادوں کو جگا کر انھیں ذاتی، خوشگوار اور غیر رسمی لب و لہجہ میں بیان کر دینے سے ہے۔ روایتی سوانح عمریوں اور ان خاکوں کے درمیان فرق صرف حجم کا نہیں، نقطۂ نظر اور منشا کا بھی ہے۔

موجودہ زندگی کی برق رفتاری، شخصیت اور وقت کے متعلق نئے تصورات اور ادب میں زندگی کا ایک جامد نقش اور فریب پیدا کرنے کی بجائے اس کی ایک حرکی تصویر پیش کرنے کی طرف میلان، یہ سب اس نئی تکنیک کو وجود میں لانے کے ذمہ دار ہیں، جو جدید ترین ناولوں، کہانیوں اور مرقعوں میں مستعمل ہوا ہے۔ "گنجہائے گراں مایہ" اور "ہم نفسانِ رفتہ" میں جو مرقعے جمع کئے گئے ہیں، انھیں پڑھنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف نے کسی باقاعدہ مرتب کی ہوئی اسکیم کے مطابق اپنے ممدوحین کی شخصیتوں کی باز آفرینی نہیں کی ہے، بلکہ ان شخصیتوں نے جو تاثرات عرصہ دراز کے ربط و ضبط کے دوران ان کے دل و دماغ پر مرتسم کئے ہیں، انھیں اپنے تجربہ، وجدان اور ذہنی سمت و رفتار میں آمیز کر کے اور ان سے ہم آہنگ بنا کر پیش کر دیا ہے۔ اس لئے ان میں وقت ایک خطِ مستقیم کی حیثیت نہیں رکھتا، اور نہ اس کے لئے تاریخی دستاویز کی قطعیت اور انضباط ضروری ہے۔ رشید صاحب کے مضامین اور سوانحی مرقعوں میں تین چیزیں مشترک معلوم ہوتی ہیں، اوّل ذاتی تعلقات کا تانا بانا، دوسرے غنائیت کی لہر اور تیسرے بعض وہ عمومی (Generalized) نکتے اور بیانات جو مشاہدات اور تجربات زندگی کا نچوڑ معلوم ہوتے ہیں۔ اور ان سب کا اثر شخصیت نگاری پر نمایاں ہے۔ ان مرقعوں میں کہیں جگہ رشید صاحب نے اس بات پر زور دیا ہے، کہ وہ شخص کو جماعت سے زیادہ اہم سمجھتے ہیں، اور ادب اور آرٹ اور انسانی لطافت کے اور دوسرے کارناموں اور مظاہر میں اختراع اور انقلاب، جماعت سے کہیں بڑھ کر فرد کا معجزہ ہے غالباً فرد کے اس احترام کا یہ اثر ہے، کہ ان مرقعوں میں سب سے زیادہ کامیاب اور دلکش مرقعے وہ ہیں، جو مصنف کی ذاتی اور گہری واقفیت کی بنیاد پر تعمیر کئے گئے ہیں۔ اس کے برعکس جہاں کسی مسلّم شخصیت سے مرعوب ہو کر انھوں نے خراجِ عقیدت پیش کیا ہے، اور ذاتی واقفیت کی غیر موجودگی میں اپنے بیانات کو مستحکم اور مزین کرنے کے لئے اپنی بے مثل انشا پردازی کا سہارا لیا ہے وہاں پڑھنے والے کو ان سے شدید اختلافِ رائے کی گنجائش محسوس ہوتی ہے۔

اس کتاب میں سب سے اچھا اور کامیاب مرقع ڈاکٹر عبدالحق کا ہے۔ ان کے متعلق یہ جملے پڑھئے:

"کم لوگ ایسے ہوں گے، جن کا علم اور اخلاق طلبا کو اس طرح اثر کر لگا ہو، جتنا ڈاکٹر صاحب کا"

"وہ اتنے خوش مزاج، زود آمیز، مخلص، ہوشمند اور ہمدرد تھے جیسے ہمارا آپ کا کوئی عزیز بے تکلف دوست، وہ کسی حال میں محتسب نہیں معلوم ہوتے تھے، بلکہ سر سے پاؤں تک محب و مشفق تھے"

"کسی آدمی کے بڑے ہونے کی ایک پہچان یہ بھی ہے، کہ اس کو غریبوں اور بچوں سے کتنی محبت ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو ان دونوں سے بڑا شغف تھا"

"باوجود ہمہ وقت کام میں مصروف رہنے کے وہ چھوٹے بڑے ہر شخص کے لئے اتنے ارزاں اور سہل الحصول تھے، جتنی سانس لینے کیلئے ہوا۔"

"وہ ہم میں سے کسی سے علم میں کم نہ تھے، عمل میں سب سے ممتاز تھے"

جو لوگ ڈاکٹر عبدالحق صاحب سے ذاتی واقفیت رکھتے ہیں، انھیں یہ ماننے میں شاید تامل نہ ہو کہ ان کے کردار اور شخصیت کے تمام بنیادی عناصر ان جملوں میں سمٹ آئے ہیں۔

سید سلیمان ندوی مرحوم کی شخصیت کی نقش گری، منفی انداز میں اس طرح شروع کی ہے:

"علامہ شبلی جتنے ذہین اور جذباتی تھے (ذہین اکثر جذباتی ہوتے ہیں) شعر کہنے اور پرکھنے کا جیسا ملکہ ان میں تھا، ان کی شاعری ان کی نثر، ان کے خطوط سب میں حسنِ طبیعت اور "سوزِ دروں" کی جیسی دل آویز مثالیں ملتی ہیں، اور دنیوی معاملات میں جیسی سوجھ بوجھ سے

وہ کام لیتے یا لے سکتے تھے، سید صاحب ان سب سے عاری تھے۔"

مثبت نقطۂ نظر سے ان کے علم و فضل اور نجی اور انفرادی شخصیت پر بالترتیب یہ چار تراشے روشنی ڈالتے ہیں:

- "سید صاحب جن علوم سے بہرہ مند تھے، ان پر ان کی نظر پیشہ ورانہ نہیں تھی، محرمانہ تھی۔"
- "کوئی مسئلہ ہو، سید صاحب اس کے موجود کو اس کے ماضی میں تلاش کئے اور پرکھے بغیر نہیں رہتے تھے .... وہ تحقیق اور تنقید میں جتنی احتیاط برتتے تھے، اور محنت کرتے تھے، اتنی ہی مطالعہ کرنے والے کے جذبات یا تخیل کو بے ضرورت مہمیز کرنے سے پرہیز کرتے تھے، تصانیف میں شبلی کا انداز مشرقی ہے، سید صاحب کا مغربی"۔
- "فطرتاً خاموش، قناعت پسند اور عافیت جو تھے۔ وہ اپنے بچوں اور ساتھیوں کے ساتھ ہنس بول لینے میں زندگی کی تفریح پالیتے تھے، اور خوش ہونے کے لئے کسی بڑی تقریب کے منتظر نہ رہتے تھے۔ چھوٹی خوشیوں میں بڑی خوشیاں ڈھونڈ لیتے"۔
- "شکل صورت، وضع قطع، چال ڈھال، بات چیت ہر اعتبار سے سید صاحب کی شخصیت بڑی دلآویز اور قابل احترام تھی۔ ان کو دیکھ کر اور پاکر ایک طرح کی تقویت محسوس ہوتی تھی، کہ وہ شفقت کریں گے، رسوا نہ کریں گے، اور جب تک ساتھ رہیں گے زندگی میں برائی اور حلاوت محسوس ہوگی"۔

یہ تراشے سید صاحب کے بلند علمی مقام اور ان کی سادہ اور دلآویز شخصیت کا پوری طرح احاطہ کرتے ہیں۔ اسی طرح شفیق الرحمٰن قدوائی، جن سے ذاکر صاحب اور جامعہ ملیہ کے توسط سے رشید صاحب کو واقفیت کا موقع ملا، چند جملوں کی مدد سے ان صفحات میں نئی زندگی پالیتے ہیں۔ ان کے متعلق ان دو تراشوں میں بہت کچھ سمٹ آیا ہے:

- "ان کو دیکھ کر پرانے زمانہ کی دور افتادہ خود کفالتی گاؤں کی یاد آجاتی تھی جہاں زندگی کی کسی ضرورت کے لئے گاؤں سے باہر کی امداد کی احتیاج نہیں ہوتی تھی۔ جو ضرورت پیش آئی، اپنے طور پر اپنے گاؤں میں پوری کرلی۔ شفیق صاحب بھی کچھ اسی طرح کے تھے۔ وہ اپنے لئے کسی دوسرے کی خدمت کے محتاج نہ تھے"۔
- "شفیق صاحب نے صحت کی تازگی اور توانائی مصیبت جھیلنے اور دوسروں کی خدمت کرتے رہنے میں ڈھونڈی اور پائی تھی۔ اس لئے مصیبت میں ان کی خوبیاں اور جگمگانے لگتیں۔ بعض پھول ایسے ہوتے ہیں، جو سایہ سے زیادہ دھوپ میں اپنی پوری بہار دکھاتے ہیں"۔

اور مرحوم کے تن و توش اور جثے کے متعلق یہ جملہ کتنا دلچسپ ہے:

"لیکن آپ کو دیکھ کر لطف آگیا، بولے وہ کیسے؟ میں نے کہا بالکل ایسا معلوم ہوا جیسے گنیش جی کا جمعیتہ العلماء ایڈیشن ہو"۔

ظرافت کے یہ چھینٹے پطرس والے مضمون میں جگہ جگہ نظر آتے ہیں۔ اس مضمون میں رشید صاحب نے طنز و ظرافت کے وسائل اور انھیں برتنے میں احتیاط کی ضرورت پر بھی زور دیا ہے۔ پطرس کے بارے میں ان کا یہ خیال صحیح ہے، کہ ان کی ظرافت عام طور سے مفرد ہوتی ہے، مرکب نہیں؛ اور ان کا یہ اندازہ بھی بالکل بجا ہے، کہ پطرس "مزے کی باتیں مزے سے کہتے ہیں" اور جلد کہہ دیتے ہیں، انتظار کرنے اور سوچنے میں پڑنے کی زحمت میں کسی کو مبتلا نہیں کرتے"۔ لیکن ان کا یہ فیصلہ قابل قبول نہیں کہ "ظرافت نگاری میں پطرس کا ہمسر ان کے ہم عصروں میں کوئی نہیں"۔ بلاشبہ پطرس کی نمایاں خصوصیات دو ہیں، اول وہ ذہانت جو روزانہ چیزوں کے مضحک پہلوؤں کو بے نقاب کرتی چلی جاتی ہے، اور دوسرے ڈرامائی عنصر لیکن بحیثیت مجموعی ان کے مزاحیہ مضامین مغربی طرز کی ظرافت کا محض چربہ معلوم ہوتے ہیں۔ فرحت اللہ بیگ زبان اور محاورہ کے استعمال سے اور خود رشید صاحب فکر و فہم کو اکسا کر جو ظرافت پیدا کرتے ہیں، وہ پطرس کے بس کا نہیں۔ ان کی ظرافت ان دونوں سے بنیادی طور پر مختلف ہے اور اسی لئے اس نے لوگوں کی توجہ کو اپنی جانب کھینچا۔ مگر یہ ظرافت اجنبی ہی ہوئی اور ضرورت سے زیادہ زود ہضم ہے۔ مغربی ظرافت کے نمونوں سے اس کی مماثلت محض سطحی اور خاصی گمراہ کن ہے۔ پطرس کے متعلق یہ اکثر سننے میں آیا ہے کہ وہ انگریزی ادب سے بہت شغف رکھتے تھے۔ راقم الحروف کو ان کی کسی انگریزی تحریر کو پڑھنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا، البتہ امریکہ سے آئے ہوئے ان کے جو خطوط اردو رسائل میں شائع ہوئے ہیں وہ ان کی ذہانت، کڑھے ہوئے ادبی ذوق اور وافر اور زرخیز تخیل کا ثبوت دیتے ہیں۔

مولوی ابوالکلام آزاد پر اس مجموعہ میں جو مضمون ہے وہ سب سے کم تسلی بخش ہے اور اس میں جن آراء کا اظہار کیا گیا ہے وہ یکطرفہ ہیں۔ موصوف کے متعلق دو باتیں تسلیم کرنے میں کسی کو تامل نہیں ہوسکتا۔ اول یہ کہ وہ غیر معمولی ذہنی استعداد کے حامل تھے، اور دوسرے ان کا سب سے زبردست کارنامہ تفسیر القرآن ہے، جس کے لئے انھوں نے فیضان سرسید سے حاصل کیا، اور اسے اپنے علم و فضل کی روشنی میں آگے بڑھایا۔ لیکن سیاست کے میدان میں مولانا کے مسلک کی یہ کہہ کر حمایت کرنا کہ انھوں نے شروع ہی میں اپنے لئے جو راہ عمل متعین کی تھی اس سے آخر تک سر مو انحراف نہیں کیا قابل قبول منطقی استدلال نہیں ہے۔ اسی طرح رشید صاحب کا یہ ارشاد کہ "وہ اتنے پبلک کے نہیں جتنے لیڈروں کے لیڈر تھے"۔ ایک طرح کا غلو ہے جسے ماننا ہر ایک کے لئے ضروری نہیں۔ رشید صاحب کا یہ قول کہ

"مولانا پہلے اور آخری شخص ہیں جنھوں نے براہ راست قرآن کو اپنے اسلوب کا سرچشمہ بنایا" بڑی حد تک صحیح ہے، لیکن اس کے بعد ہی یہ جملہ کہ "مولانا کی طبیعت پیغمبری کے رول سے اتنی سازگار نہ تھی جتنی خدائی کے رول سے" محض بے معنی ہے۔ مولانا کے خطوط کے بارے میں رشید صاحب کا یہ فیصلہ کہ "غبارِ خاطر" میں مولانا کے حسنِ طبیعت کو وہ اظہار ملتا ہے، جو "رقعاتِ غالب" میں غالب کا ہے، کسی طرح صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ "غبارِ خاطر" میں تین نمایاں عیب ہیں، اول یہ کہ یہ خطوط خود کلامی کا نمونہ ہیں، اور خطوط نگاری کے بنیادی مفروضہ کی تکذیب کرتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ ان میں ذہنی عمل کا عکس نہیں بلکہ ادعائے علمیت ملتا ہے، اور تیسرے یہ کہ ان میں شاعرانہ نثر ملتی ہے۔ اردو زبان کے نشو و ارتقا میں مولوی ابو الکلام آزاد کی تحریروں کا رول عموماً رجعت پسندانہ (Retrogressive) رہا ہے۔ پرشوتم داس ٹنڈن کے اتہام کے جواب میں جو تقریر ابو الکلام آزاد نے ہندوستانی پارلیمنٹ میں کی تھی، اس پر تبصرہ کرتے ہوئے رشید صاحب کا یہ بیان کہ "اس کے بعد اردو کی حمایت کرنا شیوۂ شرافت و انصاف سمجھا جانے لگا" ایک ایسا حسن ظن ہے جسے مستحکم کرنے کے لئے کوئی عملی شہادت موجود نہیں۔ اسی طرح مولانا کی اس تقریر کے متعلق بھی جو انھوں نے جامع مسجد دہلی میں کی تھی، اختلاف رائے کی کافی گنجائش ہے۔ اس تقریر کی جن خوبیوں کو سراہا گیا ہے، ان کے علاوہ اور ان کے باوجود دو اور چیزوں کو بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ اول وہ جذبۂ انتقام جو اس تقریر میں شروع سے آخر تک جاری و ساری ہے، اور دوسرے ایک طرح کی Attitudinizing جو تفسیر القرآن کے علاوہ مولوی ابو الکلام آزاد کی کم و بیش تمام تحریروں کا طرۂ امتیاز ہے۔ خالص فنی نقطۂ نظر سے بھی ہم اس تقریر کو خطابت کے عالمگیر اور مسلم نمونوں کے سامنے نہیں رکھ سکتے۔ البتہ اس پر رشید صاحب نے جو تبصرہ کیا ہے وہ ان کی انشا پردازی کا ایک دلکش نمونہ ہے۔

رشید صاحب کے سب سے اچھے مضامین وہ ہیں جن میں تخیل کی کارفرمائی ملتی ہے اور جن میں ذاتی تاثرات کو اجاگر کیا گیا ہے۔ انھوں نے جو مرقعے بنائے ہیں ان میں شخصیت کے چند روشن اور واضح نقطوں کو اسیر کر لیا گیا ہے ان میں خارجی واقعات کو صرف پس منظر کے طور پر بقدرِ ضرورت استعمال کیا گیا ہے شخصیت کے بنیادی عناصر کی وضاحت کے لئے نجی تجربوں، لطیفوں اور چٹکلوں سے بھی کام لیا گیا ہے ان میں ذاتی خوبیوں اور خامیوں کو گنایا نہیں بلکہ ابھارا گیا ہے، اور اس طرح شخصیت ایک جامد اکائی کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک زندہ اور متحرک عضو کل کی طرح سامنے آتی ہے۔ رشید صاحب اب عمر اور تجرباتِ زندگی کی جس منزل پر پہنچ چکے ہیں، اور اس کی بدولت ان کی نظر میں جو گہرائی نقطۂ نظر میں جو اعتدال اور اشیاء اور انسانوں کے ناپنے میں جو جامعیت اور دانائی پیدا ہو گئی ہے، اس کی جھلکیاں ان مرقعوں میں جگہ جگہ نظر آتی ہیں۔ اس پر مستزاد ان کے اسلوب بیان کی وہ ندرت، رعنائی اور صلابت ہے، جس کے پیش نظر وہ اپنے ہم عصر انشا پردازوں میں ایک منفرد اور ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ انھیں سب عناصر کی موجودگی نے سوانحی مرقعوں کے اس مجموعہ کو دلکش اور قابل قدر ادبی تحفہ بنا دیا ہے۔

خورشید الاسلام

غزل

ترا غم جب سے کم ہونے لگا ہے
ہمیں بھی اپنا غم ہونے لگا ہے

ہمارے آنسوؤں سے گاہے گاہے
ترا دامن بھی نم ہونے لگا ہے

ہم اپنے حال سے ڈرنے لگے ہیں
کہ غمخواروں کو غم ہونے لگا ہے

ہمیں تو آپ ہی تھی خود سے وحشت
تمہیں بھی ہم سے رم ہونے لگا ہے

ہماری راستی کے سامنے اب
ہمارا قد بھی خم ہونے لگا ہے

کبھی تھی جام سے جم کی بڑائی
یہاں ہر جام جم ہونے لگا ہے

کرم کی یہ نگاہیں میری جانب
کرم والو ستم ہونے لگا ہے

وجودِ آدمی سے پیشتر ہی
سرِ آدم قلم ہونے لگا ہے

کوئی چہرہ، کوئی نغمہ، کوئی جام
خفا دنیا سے دم ہونے لگا ہے

صنم پہلے خدا تھا اب خدا بھی
تراشیدہ صنم ہونے لگا ہے

یہی گھر تھا کبھی بت خانۂ چیں
یہی گھر جو حرم ہونے لگا ہے

خلیل الرحمٰن اعظمی

پہلی قسط

تذکرہ شعرائے علی گڑھ

اختر انصاری

اختر انصاری ۱۹۰۹ء میں اپنے آبائی وطن بدایوں میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد دہلی میں سول سرجن تھے اس لئے بچپن اور تعلیم کا زمانہ دہلی میں گذرا۔ اینگلو عربک اسکول اور سینٹ اسٹیفنس کالج میں تعلیم پانے کے بعد دہلی یونیورسٹی سے تاریخ میں بی اے آنرز کیا۔ والدین کا ارادہ آئی سی ایس بنانے کا تھا چنانچہ اس کے امتحان کی غرض سے لندن گئے تھے لیکن والد کی ناگہانی موت کے سبب بغیر امتحان دئے ہوئے ہندوستان واپس آگئے اور ۱۹۳۲ء میں علی گڑھ سے بی ٹی کر کے مسلم یونیورسٹی ہائی اسکول میں ملازمت کرلی۔ ۱۹۴۷ء میں اُردو میں ایم اے کا امتحان بھی پاس کرلیا اور تین سال تک شعبۂ اُردو میں لکچرر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ ۱۹۵۰ء سے ٹیچرز ٹریننگ کالج میں منتقل ہوگئے اور اب تک وہیں کام کررہے ہیں۔

اختر انصاری کا بچپن اور عنفوان شباب کا زمانہ بڑے ناز و نعم میں گذرا لیکن جب عملی زندگی میں انھوں نے قدم رکھا تو پے بہ پے ناکامیوں اور محرومیوں سے واسطہ پڑا۔ ان کا پہلا مجموعہ کلام 'نغمۂ روح' جو ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا تھا دراصل ایک ایسے نوجوان کی آپ بیتی ہے جس کا دل چوٹ کھایا ہوا ہے اور جس کے پاس اپنے شکستہ خوابوں کے سوا اور کوئی سرمایہ نہیں۔ بعد میں غزلوں کا مجموعہ 'خوناب' اور قطعات کا مجموعہ 'آبگینے' شائع ہوا۔ ان مجموعوں میں یہ رنگ اور بھی گہرا ہوگیا ہے۔ اختر انصاری کی اس دور کی شاعری میں جو رومانی افسردگی ملتی ہے۔ وہ ہمیں انیسویں صدی کے بعض انگریزی شعراء کی یاد دلاتی ہے۔ ان کا کلام بیسویں صدی کی تیسری دہائی کے بعض اُردو شعراء مثلاً جوشؔ، اختر شیرانی، حفیظؔ، ساغرؔ اور روشؔ وغیرہ کے ساتھ رکھ کر پڑھا جائے تو اس کی نوعیت اور اہمیت کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اختر انصاری کے یہاں شبابیات کی پرجوش لہر، والہانہ پن، بیباکی اور بلند آواز کی تیز موسیقی نہیں ملتی۔ ان کے یہاں آرزومندی اور تصور پرستی ہے لیکن افسردگی، کسک اور ایک تھکے نغمہ کی سی کیفیت ہے جو انھیں اُردو کے دوسرے رومانی شعراء سے ممتاز کرتی ہے معلوم ہوتا ہے انگریزی کے بعض رومانی شعراء کا انھوں نے شعوری طور پر بھی اس زمانے میں اثر قبول کیا اور کیٹس، شیلی اور بائرن وغیرہ کی جواں مرگی کو اپنا آئیڈیل بنایا۔ ان کی جوانی کی غزلوں میں اس طرح کے بہت سے اشعار ملتے ہیں

شعر کہتے ہیں جب تلک ہم اختر لیکن — اچھے شاعر یہ سنا ہے کہ جواں مرتے ہیں

لگا کے سینے سے شاد اہوں کہ سہانا — مجھے بہار جوانی میں موت آجاتی

کام سے عجلت سے مرگ ناگہاں — نکلے جلتے ہیں مرے مرنے کے دن

'نغمۂ روح' 'خوناب' اور 'آبگینے' کو سامنے رکھ کر اگر اختر انصاری کو 'یادِ ماضی کا شاعر' کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اس نوع کے اشعار میں اختر انصاری کی انفرادیت نمایاں ہوتی ہے۔

کیا یاد کرکے عشرتِ رفتہ کو روئیے — اک لہر تھی کہ ناچتی گاتی نکل گئی

ہائے غمِ فراق اٹھا میرے ناز تو — برسوں کسی کی آنکھ کا تارا رہا ہوں میں

وہ عہد نوجوانی یاد آرہا ہے مطرب! — اک نغمۂ جواں تھی جب نبض کی دھمک بھی

حسین یادوں کی شمعیں مجھے جلانے دو — مزار ہیں مرے سینے میں آرزوؤں کے

وہ وقت آہ افق پر اُبھر رہا تھا چاند — کلیجہ تاروں بھری رات کا دھڑکتا تھا

مٹ گئے وہ نظارہ ہائے جمیل — لیکن آنکھوں میں عکس چھوڑ گئے

ہمارے سر سے کبھی کا گذر گیا پانی — برس بہار کی سرشار رات خوب برس

یاد آتی ہیں جوانی کی چھلکتی راتیں — چاند تاروں کو میں حسرت سے تکا کرتا ہوں

یادِ ماضی عذاب ہے یارب — چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

اختر انصاری کی عنفوانِ شباب کی شاعری پر عندلیب شادانی نے ایک مضمون لکھا تھا جس کا عنوان "ایک تابناک ستارہ" تھا۔ اس میں اس خیال کا اظہار کیا گیا تھا کہ اختر کی غزلوں میں تاثیر اور دلکشی کے ساتھ ایک تازگی بھی ملتی ہے۔ یعنی ان غزلوں کے لہجے اور انداز بیان میں ہماری روایتی غزل کا فرسودہ پن اور یکسانیت نہیں ہے۔ جہاں تک تاثیر اور دلکشی کا تعلق ہے اس کا سبب ان غزلوں میں شاعر کے تجربات و احساسات کی صداقت اور خلوص ہے اور یہ بات بھی درست ہے کہ ان غزلوں میں لہجے کی ایک تازگی ملتی ہے لیکن شادانی نے اس بات کا تجزیہ نہیں کیا (اور شاید اس زمانے میں یہ تجزیہ کیا بھی نہیں

جاسکتا تھا) کہ ان غزلوں پر شعوری یا غیر شعوری طور پر نظم کا اثر ہے اس لئے روایتی اور استادانہ یا کتابی خیالات پر مبنی غزلوں کی نسبت ان میں تازگی اور تاثیر کا عنصر زیادہ ہے لیکن ان غزلوں کے اشعار میں وہ بلیغ رمزیت اور تجربات و احساسات کی تعمیم (Generalization) نہیں ملتی جو غزل کی اصل خصوصیت ہے اور جس کے سہارے شاعر اپنے انفرادی محسوسات کو ایک وسیع پس منظر میں پیش کرتا ہے۔ اور غزل کے شعر میں توانائی، پائداری اور بھرپور وار کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔

اختر انصاری نے بعد میں چل کر اس رومانیت سے اپنا دامن چھڑانے کی کوشش کی کیونکہ "خوناب" اور "آبگینے" میں جو کیفیت ہے وہ بہت دنوں تک کسی شاعر کے لئے سرچشمۂ شعر یا سرمایۂ حیات نہیں بن سکتی۔ "ایک ادبی ڈائری" میں لکھتے ہیں

"وہ قطعے، وہ غزلیں اور وہ رومانی نظمیں جو زندگی سے فرار کا نتیجہ تھیں، جو ایک جھوٹے سکون کی پیداوار تھیں اور جنھوں نے زندگی کے ٹھوس اور مادی حقائق کو عارضی طور پر بھلا دینے میں میری مدد کی تھی اب قطعی طور پر ایک غلط چیز معلوم ہونے لگیں۔ یہاں تک کہ ان کے تصور سے بھی گھن آنے لگی۔ ضروری معلوم ہوا کہ زندگی کے مسائل سے مردانہ وار آنکھیں ملائی جائیں اور ان کی صحیح نوعیت کو سمجھ کر ان کا مناسب و معقول حل ڈھونڈا جائے۔"

چنانچہ اب انھوں نے خارجی مسائل کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا "خندۂ سحر" اور "روحِ عصر" کی نظموں میں یہ رنگ نمایاں ہے "مونالزا" "اودے شنکر" "ڈھولک کا گیت" اور "تامنگیشکر" پر بھی انھوں نے نظمیں لکھی ہیں جن کا موضوع فن اور روحِ فن ہے اس کے علاوہ دوسری جنگ عظیم سے متاثر ہو کر نظمیں اور قطعے لکھے لیکن ان کی شاعری میں مجموعی طور پر ان کے قطعات ہی ان کی بہتر نمائندگی کرتے ہیں۔ اختر انصاری رومانی اور خالص غنائی شاعری کے دائرے سے نکل کر جب مقصدی اور ترقی پسند شاعری کی طرف آئے تو اردو میں نظم نگاری کے دو طرز مقبول تھے۔ ایک طرز سیاسی و انقلابی شاعری کا تھا جس میں خطابت اور گھن گرج تھی۔ دوسرا طرز معریٰ، آزاد اور جدید طرز کی پابند نظموں کا تھا۔ پہلے طرز سے ان کے مزاج کو شروع ہی سے مناسبت نہیں۔ دوسرے طرز کے لئے جس ذہن اور نئے زمانے کی پیچ در پیچ تجربات سے عہدہ برآ ہونے کی جیسی ضرورت ہے اس میں اختر انصاری کو خاطر خواہ کامیابی نہ ہو سکی۔ غالباً اسی لئے دس بارہ سال تک خاموش رہنے کے بعد انھوں نے اپنے ہر طرح کے داخلی اور خارجی تجربات و محسوسات کے اظہار کے لئے اپنی محبوب صنف قطعہ کو اپنالیا ہے اور اس میں شک نہیں کہ قطعہ نگاری نے اختر انصاری کی بدولت اردو میں ایک مستقل صنفِ سخن کی حیثیت پیدا کر لی ہے اور اس فن میں ان کا کوئی حریف نہیں ساں کے نئے قطعات میں فکر کے عنصر کے ساتھ ساتھ ایک تیکھاپن اور طنز کی ایسی دھار ہے جس کا سلسلہ خیام کی رباعیات سے ملتا ہے۔

انتخابِ کلام

جبرِ حیات

یہ چاہتا ہوں کہ کچھ دیر کے لئے ہمدم
تجھے بھی دل سے بھلاؤں میں خود کو بھی بھولوں
اُڑوں لگا کے تخیل کے پر زمینوں سے
کمند پھینکوں فلک پر ستاروں کو چھولوں
بچھاؤں دھومیں کبھی کہکشاں میں اور کبھی
دھنک کو گود میں لے کر گھٹاؤں میں جھولوں

بلند ہو کے بہار و خزاں کے عالم سے
ریاضِ انجم و مہتاب میں پھلوں پھولوں
مگر اُڑان کی قیمت کہاں سے دوں گا میں
بلندیوں سے گروں گا تو کیا کروں گا میں

قطعات

(۱)

ان آنسوؤں کو ٹپکنے دیا نہ تھا میں نے
کہ خاک میں نہ ملیں میری آنکھ کے تارے
میں ان کو ضبط نہ کرتا اگر خبر نہ ہوتی
پہنچ کے قلب میں بن جائیں گے یہ انگارے

(۲)

جو پوچھتا ہے کوئی سرخ کیوں ہیں آج آنکھیں
تو آنکھیں مل کے میں کہتا ہوں رات سو نہ سکا
ہزار چاہوں مگر یہ نہ کہہ سکوں گا کبھی
کہ رات رونے کی خواہش تھی اور رو نہ سکا

(۳)

میں نے حسرت سے کہا تم سے محبت ہے مجھے
تم نے شرماتے ہوئے مجھ کو جواب اس کا دیا
آہ لیکن دلِ ناشاد (یہ غارت ہو جائے)
اس قدر زور سے دھڑکا کہ میں کچھ سن نہ سکا

(۴)

قدم آہستہ رکھو کہ ممکن ہے
کوئی کونپل زمیں سے پھوٹتی ہو
یا کسی پھول کی کلی سرِ دست
مزے خوابِ عدم کے لوٹتی ہو

(باقی صفحہ ۱۱ کالم ایک پر)

محمد یٰسین

طالب علموں کے مسائل

حصول آزادی کے بعد جہاں قومی زندگی کے تمام شعبوں میں انقلاب ناگزیر تھا وہاں تعلیمی اداروں کو بھی ایک نئے بحران سے دوچار ہونا پڑا کیونکہ برطانوی نظام تعلیم بہرصورت غلامانہ ذہنیت اور مغربی اقدار کی کورانہ تقلید کو ذریعہ نجات ثابت کرتا رہا۔ اور ہمیں جمہوری ہندوستان کی سماجی و ثقافتی زندگی کے نئے تقاضوں کے پیش نظر بنیادی تبدیلیاں کرنی پڑیں۔ مگر آزادی کے فوراً بعد تعلیمی اداروں کے دوسرے مسائل کے ساتھ خود "طالب علم" ایک اہم اور سنگین مسئلہ ہو گیا ہے اور برصغیر میں طالب علموں کا رول مختلف حیثیتوں سے ہماری توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔ اس وجہ سے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ طالب علم خود مسائل سے دوچار ہیں یا وہ ہمارے لئے مسئلہ بنے ہوئے ہیں۔ اس متنازعہ بحث میں نہ پڑ کر ہم مسلم یونیورسٹی میں طلباء کے چند مسائل پر اظہار خیال کرنا چاہتے ہیں۔

مدیر "علی گڑھ" نے اپنے حالیہ اداریوں میں مسلم یونیورسٹی کے اقامتی کردار، طلباء و اساتذہ کے باہمی رشتوں اور معاشی اور سیاسی عوامل کے پیش نظر طالب علموں کی بدلتی ہوئی ذہنیت پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ پڑھائی کی حد تک ہمارے طالب علم محنتی، جفاکش اور فرمانبردار ہیں البتہ سائنس کے طالب علموں کو آرٹس اور کامرس کے طلباء پر ترجیح دی جا سکتی ہے۔ اس سلسلہ میں سہ سالہ ڈگری کورس نے پرانے نظام کو بدلنے اور طلباء میں نئی لگن پیدا کرنے میں بہت بڑا کام کیا ہے۔

ہمارے طالب علم سال بھر مستقل مزاجی سے کام کرتے ہیں لیکن نظام اوقات کچھ اس قسم کا ہے کہ انھیں کچھ اور کرنے کی فرصت نہیں ملتی۔ صبح ۸ بجے سے شام کے چار بجے تک لکچر روم، ریڈنگ اور لائبریری کے چکر کاٹتے ہوئے طالب علم کسی کام کے لائق نہیں رہ جاتے۔ اگر کسی طرح یہ ممکن ہو کہ ہمارا نظام اوقات صبح آٹھ بجے سے دو بجے تک رہے اور مختلف مضامین کے "Combination" زیادہ علمی بنیاد پر رکھے جائیں تو طالب علم کو کھیل کود اور دیگر غیر نصابی دلچسپیوں (Extra Curri-culer Activities) میں حصہ لینے کا موقع ملے۔ اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ ارباب حل و عقد اس مسئلہ کی نزاکت پر غور کر کے نظام اوقات میں ترمیم و اصلاح کر دیں۔

"ڈسپلن" کے معاملہ میں بھی ہمیں اپنے طالب علموں سے کوئی خاص شکایت نہیں لیکن غیر اقامتی (Non-Resident) طالب علموں میں ایک قسم کی لاپروائی اور بے راہ روی ضرور دیکھنے میں آ رہی ہے جس کی فوری روک تھام لازمی ہے۔ یوم سرسید کے موقع پر پروفیسر بابر مرزا نے ایک مکالمہ جو انھوں نے اپنے دفتر کے باہر سنا تھا یوں پیش کیا:

"ابے یہ کون بیٹھا ہے؟

ابے جانتا نہیں تو بابر مرزا کو؟"

دوسری مثال راقم الحروف کا ذاتی تجربہ ہے۔ شعبۂ انگریزی کے ایک مقتدر استاد کو اپنے لکچروں کے دوران پانی پینے کی عادت ہے چنانچہ ایک خاص درجہ کے چند طالب علم ایک دن یہ کہتے ہوئے سنے گئے:

"دیکھا پانی پلا دیا اس کو!!"

اس زمرہ میں وہ طالب علم بھی ہیں جو پان کھائے، سیٹی بجاتے بغیر بٹن کی شیروانی زیب تن کئے لکچر روم کے باہر اپنی زندہ دلی کا ثبوت دیتے پھرتے ہیں۔ اب تک اعداد و شمار سے یہ اندازہ ہوا کہ ان میں اکثریت غیر اقامتی طالب علموں کی ہے جو پیدل یا سائیکلوں پر آتے ہیں اور کالج کو محض تفریح کا ذریعہ سمجھتے ہیں یہیں ہمیں اپنے ادارہ کی اقامتی کردار کی اہمیت محسوس ہوتی ہے۔ اگر ہوسٹلوں میں نگراں حضرات کڑی نظر رکھیں تو یہ مرض آگے نہیں بڑھنے پائے۔ یہ صحیح ہے کہ ادھر ہم کچھ مصلحتوں کی بنا پر غیر اقامتی طلبا کو ۲۵٪ فیصدی سے زیادہ داخلہ دینے پر مجبور رہے ہیں لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ آئندہ اس اصول کی سختی سے پابندی ہو اور غریب طالب علموں کے لئے سستے ہوسٹل کو جلد سے جلد قائم کیا جائے جہاں اوسط ماہانہ خرچ پچاس روپیہ سے زیادہ نہ ہو۔ ہم اولڈ بوائز ایسوسی ایشن اور اس کے معتمد جناب کنور عماد احمد صاحب کو مبارکباد دیتے ہیں کہ انھوں نے یہ مستحسن قدم اٹھایا ہے۔ ہوسٹل کی تعمیر اور اجراء میں مسلم یونیورسٹی کے اساتذہ بھی ان کے ساتھ ہیں اور حسب مقدور معاونت کے لئے بھی تیار ہیں۔ اسی کے ساتھ ہمیں یہ بھی امید ہے کہ ہمارے رفقائے کار اس ہوسٹل کے اعزازی نگراں ہونے کے لئے اپنی خدمات کی پیش کش کریں گے۔

نظام اوقات کی طوالت اور اقامتی زندگی کی ڈھیل سے طالب علموں میں ایک عجیب قسم کی اکتاہٹ (Boredom)

(باقی صفحہ ۱۱ کالم ۲ پر)

ڈاکٹر سید عابد حسین

عہدِ وسطیٰ کی مسلم تہذیب

(گذشتہ سے پیوستہ)

مگر در اصل مسلمانوں کے ذوقِ جمال کا پورا اظہار فنِ تعمیر کی شکل میں ہوا جس کے نمونے ترکستان سے اسپین تک متعدد طرزوں میں موجود ہیں اور مقامی اختلافات کے باوجود ان میں ایک بنیادی وحدت پائی جاتی ہے "سائے کا سکون و راحت، روشنی کی آب و تاب، قوت اور شوکت کا نزاکت اور لطافت کے ساتھ امتزاج وہ مشترک خصوصیات ہیں جو سب اسلامی ملکوں کی بہترین تعمیروں میں موجود ہے"

علمی اور جمالی پہلو کے علاوہ مادی حیثیت سے بھی اسلامی تہذیب نے حیرت انگیز ترقی کی تھی۔ دنیا کے مختلف ملکوں میں خشکی اور سمندر کے راستے آمد و رفت اور تجارت کو فروغ دینے میں جو زبردست حصہ مسلمانوں نے لیا وہ ان کی تہذیب عالم کی خدمات میں ایک نہایت اہم خدمت ہے۔ فوجیں شاہراہوں کی حفاظت کرتی تھیں۔ صحراؤں میں کنوئیں کھودے گئے تھے اور مقررہ فاصلوں پر کارواں سرائیں تعمیر کی گئی تھیں۔ مصر، حبش، ایران، وسط ایشیا، روس، چین اور ہندوستان کا تجارتی مال عرب کے بازاروں میں آکر بکتا تھا۔ اسپین سے مشرقِ بعید تک جہازوں کی آمد و رفت تھی۔ ایک عرب بیڑا جبرالٹر سے گذر کر بحرِ اٹلانٹک میں تفتیش کی غرض سے گیا تھا اور اگر ایک شدید طوفان اسے بہاکر راستے سے نہ ہٹا دیتا تو شاید امریکہ کئی صدی پہلے دریافت ہو چکا ہوتا۔ بہرحال گو مسلمانوں کی تجارت صرف قدیم دنیا تک محدود تھی لیکن جس طرح ان کے منچلے پن اور مہم جوئی نے پرانی دنیا کے تینوں براعظموں کو ایک دوسرے سے ملاکر ایک واحد تجارتی بازار بنا لیا تھا۔ ان سے پہلے تاریخِ عالم میں کوئی قوم نہیں کر سکی تھی۔

تجارت کے ساتھ ساتھ صنعت و حرفت بھی مسلمانوں کا محبوب مشغلہ تھا۔ اہلِ حرفہ اسلامی سوسائٹی میں عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ صوبوں کے گورنر، فوجوں کے سپہ سالار اور بڑے بڑے عالم دستکاروں اور پیشہ وروں کے خاندان سے متعلق ہوتے تھے اور وہ اپنے پیشوں کے نام کو لقب کے طور پر بے تکلف استعمال کرتے تھے۔ صنعت کی ترقی کی تفصیلات کو چھوڑ کر ہم صرف تین چیزوں کا ذکر کرتے ہیں جن کے ذریعے سے مسلمانوں نے دنیا کے تمدن میں ایک عظیم الشان انقلاب کی داغ بیل ڈال دی۔

اور عہدِ جدید کی حیرت انگیز ترقیوں کی راہ کھول دی۔ بارود، قطب نما اور کاغذ تینوں چیزیں قدیم روایات کے مطابق چینیوں کی ایجاد ہیں لیکن ان تینوں چیزوں کو سب سے پہلے مسلمانوں نے عام صنعتوں کی حیثیت دی۔ ان سے بہت بڑے پیمانے پر کام لیا اور انھیں اس دنیا میں اس سرے سے اس سرے تک پھیلا دیا۔

غرض مادی تہذیب میں بھی مسلمان اس دور میں جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں سب قوموں سے آگے تھے بلکہ اس میدان میں تو وہ اس کے بعد بھی صدیوں تک آگے رہے۔ آخر میں ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ مسلم تہذیب نے اس زمانے میں جب وہ بین الاقوامی تہذیب کی حیثیت رکھتی تھی مغربی تہذیب پر کیا اثر ڈالا۔

یہ اثر دو مرکزوں سے پڑا۔ ایک اسپین سے جہاں مسلمانوں کی ایک بڑی سلطنت پونے تین سو سال تک (۷۵۵ء تا ۱۰۳۱ء) اور اس کے بعد بہت سی چھوٹی چھوٹی ریاستیں ساڑھے چار سو سال سے زیادہ قائم رہیں۔ دوسرا مرکز سسلی تھا جس پر مسلمان عربوں کے حملے ساتویں صدی کے وسط سے شروع ہو گئے تھے لیکن پورے جزیرے پر حکومت کچھ کم دو سو سال (نویں صدی کے شروع سے گیارھویں صدی کے شروع تک) رہی اور کچھ عرصے کے لئے وہ جنوبی اٹلی پر بھی قابض رہے اس کے بعد نارمن خاندان کی حکومت کے زمانے میں بھی سسلی اور جنوبی اٹلی میں مسلمان رعایا کی حیثیت سے مدت تک موجود رہے۔ اس عرصہ میں مقامی یونانی، رومی تہذیب اور مسلم تہذیب نے ایک دوسرے پر بہت گہرا اثر ڈالا۔

اسپین میں عرب مسلمانوں کا اثر وہاں کی شاعری، موسیقی، علوم و فنون اور صنعت و حرفت پر بہت گہرا پڑا جو اب تک وہاں مختلف شکلوں میں باقی ہے۔ مذہبی تعصب کے کم ہونے کے بعد اب اسپین میں ان اثرات کی تحقیقات ہو رہی ہے جو مسلمانوں نے وہاں کی تہذیب پر ڈالے تھے۔ اب کچھ دنوں سے اسپین کے باشندے عام طور پر اپنے ملک کے اسلامی دور کو اپنی قومی تاریخ کا ایک شاندار دور سمجھ کر اس پر فخر کرنے لگے ہیں۔

اس کے علاوہ اسپین سے مسلمانوں کے علوم یعنی فلسفہ، طب، ہیئت، ریاضی، فرانس اور وہاں سے جرمنی، وسطِ یورپ اور انگلستان پہنچے۔ ان ہی کی بدولت یورپ کے اندھیرے زمانے کا خاتمہ ہوا اور وہاں عہدِ وسطیٰ کا دوسرا دور شروع ہوا جس نے ذہنوں میں

بیداری اور تجسس کا مادہ پیدا کر کے نشاۃ ثانیہ کے لئے راہ ہموار کی اسی طرح مسلم تہذیب کا ایک اور ذہنی دھارا سسلی سے اٹلی اور وہاں سے بقیہ یورپ پہنچا۔ یہ بات قابل لحاظ ہے کہ مسلمانوں کا تہذیبی اثر سسلی اور جنوبی اٹلی پر خود ان کی حکومت کے دور میں بہت کم پڑا اس لئے کہ اس زمانے میں وہ برابر مقامی حکومتوں سے جنگ و جدل میں مصروف رہے لیکن جب مسلمانوں کی حکومت ختم ہوگئی اور نارمن خاندان نے اس علاقے پر اپنا تسلط کر کے وہاں امن و امان کی فضا پیدا کی تو مسلمانوں کی تہذیب کی قدر ہونے لگی اور اس کا گہرا اثر مقامی تہذیب پر پڑنے لگا۔

فریڈرک ثانی نے جو ۱۲۱۵ء میں سسلی کے تخت پر بیٹھا عرب لباس اختیار کیا اور مسلم علوم کو اپنی ساری قلمرو میں جس میں جنوبی اٹلی بھی شامل تھا فروغ دیا۔ یہاں سے یہ علوم شمالی اٹلی میں پہنچے۔ پیڈوا اور بولونا کی یونیورسٹیاں جو غالباً عہد وسطیٰ کی سب سے اہم درسگاہیں تھیں مسلم علوم کا مرکز بن گئیں۔

غرض مسلم تہذیب بجائے خود جو اہمیت رکھتی ہے اس سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو یورپ کے عہد وسطیٰ کی ذہنی تاریخ کے لئے اس کی یہ اہمیت ہے کہ اس نے سائنس کی مشعل کو یونانیوں سے لے کر صدیوں تک روشن رکھا، اس کی روشنی کو اور بڑھایا اور اسے پھر مغرب کے حوالے کر دیا۔

(باقی صفحہ ۸ کالم ۲) — **اشعار**

یادش بخیر عہد محبت کی شاعری — اک وہ بھی جو گیت کے سانچے میں ڈھل گئی

بے امنگ اجڑے ہوئے دل میں بھری کیا کہنا
ایک ویرانے میں رہتی ہے پری کیا کہنا

زندگی راگ میں تبدیل ہوئی جاتی ہے
نغمۂ عشق کی جادو اثری کیا کہنا

دل کا خوں آنکھوں میں کھنچ آیا چلو اچھا ہوا
میری آنکھوں کو مرا احوال کہنا آ گیا

آئینۂ نگاہ میں عکس شباب ہے
دنیا سمجھ رہی ہے کہ آنکھوں میں خواب ہے

اے سوز جاں گداز! ابھی میں جوان ہوں
اے درد لا علاج! یہ عمر شباب ہے

مدتوں کھیلی ہیں مجھ سے غم کی بے حس انگلیاں
میں رباب زندگی کا اک شکستہ تار ہوں

خواہیں یوں مرے شباب کے دن — جیسے جاڑوں کی چاندنی راتیں

شباب درد بھری زندگی کی صبح سہی
پیوں شراب یہاں تک کہ شام ہو جائے

حالِ دل پوچھ کر رُلا دے کوئی — پھر طبیعت میں کچھ گرانی ہے
ہائے وہ عالم بے نام کہ جس عالم میں — بیت جاتے ہیں دل زار پہ عالم کیا کیا

(کالم ۲ صفحہ ۹ سے آگے) — اور بیزاری کا بھی احساس عام ہے۔ یونین میں تقریری و تحریری مقابلے ہوں اور گھنٹی بجاتے بجاتے چپراسی کے ہاتھ شل ہو جائیں لیکن طلبہ کمروں سے باہر نکلنے کا نام نہیں لیتے۔ اکثر مقررین کی تعداد سامعین سے زیادہ رہتی ہے۔

پچھلے چند برسوں سے ہم اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ ہمارے طالب علموں کا ایک خاص طبقہ اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لئے کوشاں رہتا ہے لیکن عام طالب علم "کیفے الف لیلیٰ" میں فلمی ستاروں اور بازاری معاملات پر تبادلۂ خیالات کو ترجیح دیتے ہیں ؎

کہاں یہ فطرتی جوش طبیعت — کہاں ٹھونسی ہوئی چیزوں کا احساس؟

بہرحال اس ذہنیت کے خلاف طالب علموں کا ایک حلقہ خود سرگرم ہے اور ہمیں امید ہے کہ حالات جلد سدھر جائیں گے۔

طالب علموں سے متعلق ایک اہم مسئلہ "سیاست" بھی ہے لیکن خدا کا شکر ہے کہ یہ زہر ابھی ہمارے طالب علموں میں نہیں سرایت کر سکا ہے یہ طرہ امتیاز اساتذہ کے ایک مخصوص حلقہ کا البتہ رہا ہے جنھوں نے تقسیم کے بعد افراتفری میں ایک مخصوص نظام فکر کی تلقین کیلئے جائز ناجائز طریقے اختیار کئے اور احباب کے مختلف شعبوں میں تقرر و بحالی (Appoint-ment) کے علاوہ اپنی نجی ترقیوں کے لئے بھی مستقل طور پر کوشاں رہے غالباً ڈاکٹر ذاکر حسین نے اسی ذہنیت کے پیش نظر کہیں کہا تھا کہ یونیورسٹی دانشگاہ سے زیادہ پرورش گاہ ہوتی جا رہی ہے۔ شکر کا مقام ہے کہ یہ طلسم اب ٹوٹ چکا ہے اور نام نہاد "انسان دوستوں" کی اقربا پروری اور ذاتی ترجیحات (Careerisme) کا دور بھی ختم ہو چکا ہے لیکن ہمیں اس کا بھی خدشہ ہے کہ ہم دوسری انتہا کے شکار ہو جائیں۔ ہماری یونیورسٹی قومی تعلیم گاہوں میں ممتاز حیثیت رکھتی ہے اور یہاں ہندو مسلمان سکھ اور عیسائی بھائی بھائی کی طرح رہتے ہیں۔ ہماری کوشش ہونی چاہیے کہ خارجی عناصر یونیورسٹی یونین کو کسی پلیٹ فارم کسی مخصوص نظام فکر کا پروپیگنڈہ نہ کر دیں ہم بحیثیت طالب علم ہر مدرسۂ فکر سے استفادہ کر کے اپنا منفرد راستہ بنانا چاہتے ہیں اور تنگ نظری و رجعت پسندی کی جگہ قومیت اور وسیع المشربی کے قائل ہیں۔ ہمیں اس کا بھی احساس ہے کہ بحیثیت ایک مرکزی ادارہ کے عام مسلمانوں کی تعلیمی و ثقافتی رہنمائی کے ساتھ ان کی سیاسی رہبری و قیادت کا ذمہ بھی ہمارے سر پر ہے۔ ہمارے طلبہ اور اساتذہ اس سلسلہ میں جمہوری طریقہ پر اہم خدمات انجام دے سکتے ہیں :—

؎ اور دل کا ہے پیام اور میرا پیام اور ہے
عشق کے درد مند کا طرز کلام اور ہے

(باقی صفحہ ۳ کالم ۲) یا بعض دوسرے جدید شعراء کی چیزیں مثلاً نظم یاس ان کی شاعری کے اس عنصر کو اگر خورشید صاحب (باقی صفحہ ۱۲ کالم ۲)

یونیورسٹی کی خبریں

وزیر اعظم کشمیر کی آمد

بخشی غلام محمد وزیر اعظم ریاست جموں وکشمیر ۱۶ر جنوری کو علی گڑھ آکر فیکلٹی آف آرٹس کی عمارت کا سنگ بنیاد رکھیں گے۔

انڈین ہسٹری کانگریس

انڈین ہسٹری کانگریس کا تیئسواں سیشن ۲۶ر دسمبر سے ۲۸ر دسمبر تک شاندار طور سے منعقد رہا۔ جس میں مختلف یونیورسٹیوں کے نمائندوں نے ہندوستان کی عہد بہ عہد تاریخ پر اپنے مقالات پڑھے۔ اس سیشن میں مرکزی حکومت کے وزیر تعلیم ڈاکٹر شریمالی نے بھی شرکت کی آزاد لائبریری میں ایک تاریخی نمائش بھی منعقد کی گئی۔

اگزیکٹو کونسل کا جلسہ

یونیورسٹی کی اگزیکٹو کونسل کا ایک جلسہ ۲۷ر نومبر کو وائس چانسلر صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں سلامت اللہ صاحب، ڈاکٹر منیر احمد، ڈاکٹر رضا حسین زیدی اور فضل الرحمن صاحب کو ریڈر مقرر کیا گیا۔ پروفیسر پی۔ ایس گل صدر شعبۂ فزکس کو اجازت دی گئی کہ وہ انڈین ریسرچ کمیٹی (شعبۂ زراعت حکومت ہند) کے مشاورتی بورڈ کی رکنیت تین سال کے لئے قبول کرلیں۔ وائی ڈی خان صاحب رجسٹرار کی ملازمت کی توسیع ۱۵ر مئی سنہ ۱۹۶۳ء تک کی گئی۔ شعبہ انگریزی کے لکچرر مسعود الحسن صاحب اور اے ایچ جعفری صاحب اور میکینکل انجینئرنگ کے لکچرار صابر رضا صاحب کو تعلیمی رخصت Study Leave دی گئی۔ شمیم احمد صاحب لکچرر سول انجینئرنگ کو مبلغ دو ہزار روپے تعلیمی قرضہ دیا گیا۔

یوم مجاز

۱۹ر دسمبر کو یہاں اسٹریچی ہال میں اردو کے محبوب شاعر اسرار الحق مجاز کی یاد میں 'یوم مجاز' منایا گیا جس میں علاوہ دوسرے پروگراموں کے ایک مشاعرہ بھی منعقد ہوا۔ ساحر لدھیانوی، کیفی اعظمی، مسعود علی ذوقی، مسعود حسین خاں، خلیل الرحمن اعظمی، وحید اختر اور راہی معصوم رضا نے شرکت کی۔

اسی سلسلے میں این آر ایس سی لٹریری سرکل کی طرف سے یونیورسٹی کے طالب علم شعراء کے لئے مجاز میموریل مقابلہ بھی منعقد کیا گیا تھا۔ اس سال کا انعام ایم اے فائنل (اردو) کے طالب علم شہریار صاحب کو ملا۔

شعبۂ دینیات کا جلسہ

شعبۂ دینیات سنی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے طلبہ کی انجمن کے زیر اہتمام ۱۳ر دسمبر کو علمی نشستوں کا آغاز ہوا۔ جس میں مولانا محمد تقی امینی صاحب نے 'اجتہاد کی اہمیت' کے عنوان سے ایک مقالہ پڑھا۔ جلسہ کی صدارت جناب کرنل بشیر حسین زیدی صاحب وائس چانسلر نے فرمائی۔

(باقی صفحہ ۱۱ کالم ۲) پروان چڑھائیں تو اس میں امکانات بہت ہیں۔

پروفیسر آل احمد سرور نے اپنی تقریر میں کہا کہ خورشید الاسلام صاحب کی شاعری میں تجربے کی گہرائی، احساس کی صداقت جذبے کی آنچ اور ایک ایسا آہنگ ملتا ہے جو شاعرانہ شخصیت سے پیدا ہوتا ہے ان کے انداز بیان میں ایک تازگی اور انفرادیت ہے۔ کلاسیکی لہجے کے بجائے یوں کہنا چاہیے کہ اس میں ایک ربط و تعلق ملتا ہے وہ کلاسیکی لہجہ برتنے کے بجائے اس سے آشنا ہیں اور ان کے شعری افکار میں اپنی سرمائے کے علم کی گونج ملتی ہے لیکن میر غالب وغیرہ سے استفادہ کے باوجود ان کی بعض چیزوں میں ہمیں ان کی انفرادیت ملتی ہے "پیاس" اور ان کی مختصر نظمیں اس دور کے تجربات کا عکس ہیں "روٹھ گئے" اور "مجھ کو نہ چھیڑو" ان کے مزاج کی آئینہ داری کرتی ہے جس میں خوبی ہے لیکن ایک خطرہ بھی ہے خطرہ یہ کہ کہیں یہ تجربات تلخی اور یاسیت کی طرف نہ لے جائیں شاعر جب بعض چیزوں سے متصادم ہوتا ہے تو وہ زہر کے پردے چاک کرنا چاہتا ہے لیکن یہ خطرہ رہتا ہے کہ اسکے لہجے میں زہر زیادہ نہ آجائے۔ اس زہر کو امرت بنانا ہے ہمارے یہاں یہ خرابی ہے کہ لوگ یا تو صرف شعر لکھتے ہیں یا صرف مضمون میں سمجھتا ہوں کہ جو شخص شاعر بھی ہو (ضروری نہیں کہ وہ بہت اچھا شاعر ہو) وہ اچھا ناقد ہوگا اسی طرح جس میں تنقیدی شعور ہوگا اسکی شاعری بھی مجموعی طور پر بہتر ہوگی۔ اسی لئے میں خورشید الاسلام کی شاعری کا خیر مقدم کرتا ہوں۔

خلیل الرحمن اعظمی سکریٹری

حسن مثنی انور

غزل

نہ دلکشی نہ کوئی بانکپن نہ رعنائی
چمن میں کیسے سمجھ لوں کہ ہے بہار آئی

ارادے جونک پڑے حسرتیں مچلنے لگیں
کسی نے چھیڑی ہے یوں زندگی کی تنہائی

خرد فریب نظر کی حدوں سے ہے آزاد
جنوں نے توڑ دیا ہے طلسم رعنائی

کہاں ہے مہر تمنا کہاں ہے صبح مراد
الجھ رہی ہے ابھی تیرگی سے بینائی

ہزار کوئی مسیحائے وقت ہو لیکن
غم حیات کی دشوار ہے مسیحائی

وہی ہے واقف اسرار دو جہاں انور
جسے سمجھتی ہے دنیا بس ایک سودائی